اُردو کے ترقی پسند شعرا اردو آدمیت کے تصورات

محمد نعمان طاہر / طارق ہاشمی☆

Abstract:

First world war gave way to the utilisation of human beings for capitalist benifits.Humans were thrown into the fire as fuel.Hatred for such system proved fruitful in getting rid of explotation from such a system.Progressive Writers Association and Halqa Arbab e Zauq were two literary movements and trends running parallel at that time in sub-continent.Iqbal, Faiz and Zaheer Kashmiri and Ahmed Nadim Qasmi are some of the names who wrote for a new and better image of human beings.They presented a free and free of exploitation humans who can break chains of slavery and exploitation through their awarenes.Man is innately free so he can not be chained for long.Westeren concept of a man free from god and religion was strongly opposed by Qasmi.Only love for other human beings is a solid solution to end exploitation in the world.

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ، آزادی ہندوستان کے باسیون کے لیے بدیہی طور پر ایک شدید دھچکے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ انگریزوں کی طرف سے آخری نشتر تھا جس نے ہندوستان کے سینے میں پیوست ہو کر ان کی رہی سہی اور محصور بادشاہت کو تہ خاک کر دیا۔اس دھچکے کے بعد اہلِ ہندوستان نے اپنے احتساب کی کوشش کی۔ زندگی کے تمام شعبون مثلاً معاشی، ادبی، تعلمی اور طبقاتی رجحانات میں آہستگی سے تغیر پیدا ہونا شروع ہوا۔

جنگ عظیم اوّل ایک ایسے طوفان کی طرح دنیا پر مسلط ہوئی کہ رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ اب پوری دنیا پر حکومت کے خواہش مند نے آدمی اور آدمیت دونوں کو داؤ پر لگا دیا اور سرمایہ دار قوتوں نے اپنے معاشی نظام کو بچانے کی خاطر جن انسانوں پر اپنا نظام اور حکومت مسلط کر رکھی تھی انہیں کو جنگ کا ایندھن بنا کر رکھ دیا۔ اس سفاکانہ رویے سے بچ نکلنے والے لوگ اس حقیقت کو پا گئے کہ جنگ اور امن دونوں میں عوام ہی گھاٹے میں رہتے ہیں اور بالا دست

☆ ایم۔فل اسکالر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

افراد اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔

اس طرح اس جاری نظام کے خلاف نفرت کا بیج عام آدمی کے دل میں خودبخو دبو دیا گیا جو بعد میں استحصالی نظام سے آدمیت کے آزادی دلانے کے احساس کی شکل میں تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا اور اس دور کے آدمی نے اپنے آپ کو حقیقتاً آدمیت کے مرتبے پر لے جانے کی سعی کرنے کی ٹھان لی ۔اس رویے کے بارے میں احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''آزادی کی ایک بے پناہ لہر اٹھی اور ایسے نظام کی تلاش ہوئی جس میں انسانی زندگی کی قدر ہو،جس میں محبت بخش نسو ونما کا موقع ملے،جس میں دولت کی بجائے انسانیت کی قدر ہو،جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کر سکیں، یہ کوئی خواب نہ تھا بلکہ انیسویں صدی کے وسط میں اپنے فلسفہ حیات کا پتا چل گیا تھا جو انسان پر انسان کی حکومت کا خاتمہ کر سکے۔''(۱)

ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ میں ہوا۔ یہ تحریک باقاعدہ ادبی منصوبہ بندی کے ساتھ ادب کے میدان میں ابھری۔ اس تحریک کا مقصد ادب اور زندگی کے درمیان رشتوں کو واضح طور پر سامنے لانا تھا۔تاہم بعد میں اس تحریک کی سرگرمیوں میں کارل مارکس کی معاشی جدلیات کی گونج صاف طور پر سنائی دینے لگی۔

ترقی پسند ادب نے اپنے لیے ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ راہ عمل بھی متعین کر لی اور اس راہ کی منزل بلا تفریق مذہب وملت اور رنگ ونسل آدمیت کے کھوئے ہوئے وقار کی تلاش تھی ۔ترقی پسند تحریک کا مرکز ومحور انسان کا دکھ تھا اور بالخصوص تیسری دنیا کا وہ مجبور مقہور انسان کی جو غلامی کے ایک دراز سلسلے میں قید حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کر رہا تھا۔

ترقی پسند تحریک کے زوروشور کے عہد (۱۹۳۹ء) میں حلقہ ارباب ذوق کی ابتدا ہوئی۔ یہ ترقی پسند تحریک کے ردعمل میں تو نہیں آئی تاہم ترقی پسندوں اوران کی ادبی منصوبہ بندیوں سے شدید اختلاف نے حلقہ ارباب کو مکتبہ فکری حیثیت دی اور حلقہ نے ترقی پسند تحریک کے متوازی بساط کی صورت اختیار کر لی۔

اقبال کے بعد عوامی سطح پر سب سے زیادہ مقبولیت پانے والے شاعر فیض کارل مارکس کے جدلی مادیت کے نظریہ کے زیر اثر اور پاکستان میں شخصی حکومتوں کی بالادستی اور عوامی اداروں کے انتشار کی بدولت طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں درپیش صورت حال کو منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں۔

پاکستان میں آزادی کے وقت اردو نظم کے معروف شعرا جن کی طوطی بولتا تھا، فیض کو ان میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔فیض نے آزادی کے ساتھ بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں جو ان کے ادبی مسلک کے آدرش کی پیدا کردہ تھیں لیکن آزادی کے ساتھ مسرت وشادمانیوں کے بجائے دونوں ممالک میں دھرتی خون کی ہولی سے لال اور فضا ظلم اور خوف سے مسموم وتاریک دکھائی دے رہی تھی۔

> ''ایک سمت ایک نیا ملک آزادی کی ترنگ میں چراغاں کا اہتمام کر رہا تھا تو دوسری طرف لاتعداد گھروں میں مسرت اوراطمینان کے چراغ گل ہو رہے تھے۔۔۔ہمارا نیا آزاد ملک ابھی اپنے پاؤں

پر کھڑا ہونے نہیں پایا تھا کہ اس پر یکے بعد دیگرے کئی پہاڑ گرے۔"(۲)

فیض احمد فیض ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے سرگرم شعرا میں سے تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے فوراً بعد حالات کی ناگواریت کو ترقی پسند شعرا نے بورژوا طبقے کی عیاری و مکاری سے تعبیر کیا۔ فیض کے خیال میں بورژوا طبقہ آدمیت کے حقوق غصب کر چکا اور انسان سے اس کی آزادی چھین کر انہیں ظلم و جبر کا نشانہ بنا رہے ہیں، ان کے اس رویے نے ملک عزیز کے امن و سکون کو غارت کر دیا ہے۔ رزقِ حلال کمانے والا طبقہ محنت کش، مزدور کسان اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ امن و آزادی کے خواہاں ان استحصالی طبقات کا جنم اس عہد میں نہیں ہوا یہ تو ہر عہد کا حصہ رہے ہیں۔

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی ستم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی (۳)

فیض کہتے ہیں کہ جابر طبقہ معصوم انسانیت سے ان کی خوشیاں چھین لیتا ہے اور انہیں مختلف طرح سے دھوکوں سے میں الجھائے رکھتا ہے۔ لیکن یہ کھیل اس وقت تک ہی چلتا ہے جب تک معتوب طبقہ غافل رہتا ہے اور انہیں خوابِ غفلت سے جگانے والا کوئی نہیں ہوتا ورنہ یہ طبقہ ظالم و جابر طبقات کو نیست و نابود کر کے ان سے وہی سلوک کرنے کی طاقت رکھتا ہے جو ان کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ نظم کتے میں انہوں نے مظلوم طبقے کی بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ نظم کے آخر میں لکھتے ہیں:

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے (۴)

فیض کے خیال میں انسان کو محسوس اور غیر محسوس زنجیروں میں جکڑ لیا گیا ہے اور اس کے ہونٹوں پر مہر خموشی ثبت کر دی گئی ہے۔ مظلوم آدمی اس قید کی صعوبتوں کو برداشت تو کر رہے ہیں لیکن اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ نظم "بول" میں فیض نے اس فصیل، جبر کو توڑ کر صدائے وغا بلند کرتے ہیں اور آدمی کو اس آزادی کا احساس دلاتے ہیں:

بول کہ اب لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے

تیرا ستون جسم ہے تیرا _ _ _ _
بول ، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکان مین
تند ہین شعلے ، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلون کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن (۵)

فیض اس امر پہ یقین رکھتے ہیں کہ زمین پر ایک روز ظلم ختم ہو جائے گا اور محروم طبقہ اپنے بنیادی حقوق، امن اور آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تب حاکم اور محکوم کا تصور ختم ہو جائے گا اور تمام آدمی مساوی ہوں گے۔ اس وقت مظلوم طبقہ سکون اور راحت میں ہو گا اور ظالم اپنے مظالم کا مزہ چکھیں گے۔ فیض کے نزدیک دنیا چونکہ مقافاتِ عمل ہے۔ اس لیے ظالموں کو اپنی فردِ عمل کا حساب دینا ہو گا۔ اپنی نظم ''تین آوازیں'' میں وہ اسی یقین کا اظہار کرتے ہیں۔ نظم میں پہلی آواز ظالم کی ہے۔ وہ اپنے مظالم کا نہ صرف اعلان کرتا ہے بلکہ اپنے کریہہ اعمال پر فخر بھی کرتا ہے۔ وہ ظلم کو قانونِ دنیا سمجھتا ہے۔ دوسری آواز مظلوم آدمی کی ہے جو خدا کے سامنے شکوہ اور فریاد کرتا ہے۔ نظم کے آخر میں ندائے غیب آتی ہے:

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنے فردِ عمل کو سنبھالے
اٹھے گا جب جمع سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچا لے
جزا ، سزا سب یہیں پہ ہو گی
یہیں عذاب و ثواب ہو گا
یہیں سے اٹھے کا روزِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہو گا (۱۰)

فیض انسانی مساوات کے قائل ہین وہ طبقاتی تفریق کی نفی کرتے ہیں۔ وہ طبقہ جو انسان کو اس کے حقوق سے محرم رکھنا چاہتا ہے۔ فیض اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں۔ فیض محروم انسانوں کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کا پیغام معاشرے کے ہر مظلوم انسان کے لیے ہے۔

عہد حاضر میں جب کہ انسان اپنے فہم اور عقل سے کائنات تسخیر کرتا ہے۔ طبقاتی تفریق اور ذاتی مفادات کے حصول کی کوششیں حقیر تر حرکتیں ہیں۔ فیض کے متعلق گوپی چند نارنگ کی رائے کے ساتھ ہم فیض کے شعور آدمیت پر بحث ختم کرتے ہیں۔

"فیض کے یہاں تاریخی شعور یا سماجی احساس یا انقلابی فکر کوئی محدود اور وقتی چیز نہیں بلکہ یہ جمالیاتی اظہار کی راہ پا کر ایک عام انسانی آفاقی کیفیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔"(۶)

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ظہیر کاشمیری دوسرا معتبر نام ہے اور اُن کی نظم میں شعور آدمیت وہی ہے جو ترقی پسند تحریک کا منشور ہے۔ ترقی پسند تحریک "عظمتِ آدم" کی علمبردار ہے۔ انسان، عظیم زمین پر ازل سے ظلم اور جبر کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے اور اسے پائے استبداد مسلسل پامال کر رہا ہے۔ ظہیر کاشمیری اپنی شاعری کو ان طاقتوں کے خلاف پیکار قرار دیتے ہیں جو شرف انسانی کا استحصال کر رہی ہیں۔

عظمت آدم کے پیش لفظ کا اختتام اس جملے پر کرتے ہیں:

"آج میری لڑائی ان ہزار ہا دانشوروں اور فنکاروں کی لڑائی ہے جو اقتصادی اور تہذیبی طور پر انسان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔"(۷)

ظہیر کاشمیری نے اپنے اسی موقف کو "چراغ آخر شب" کے پیش لفظ میں دہرایا جس سے ان کے عقیدہ کی مضبوطی کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے شعری سفر کو اسی عقیدہ تعبیر کیا ہے۔ لیکن "عظمت انسان" میں ان کی فکری سطح اتنی عمیق نظر نہیں آتی جو گہرائی "چراغ شب" کی نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ "عظمت انسان" میں لفظیات اور تکرار میں بے مزگی اور سپاٹ پن کا احساس ہوتا ہے۔ جبکہ "چراغ آخر شب" میں ان کی فکر تو عمیق تر دکھائی دیتی ہی ہے اس کے ساتھ ان کے اسلوب میں بھی دلکشی اور عمدگی کے آثار نظر آتے ہیں۔

ظہیر کاشمیری نے ابتدائی دور میں برطانوی سامراج کے خلاف لکھا۔ انہوں نے اپنی نظم میں جہالت، مفلسی، ظلم اور تشدد جیسی قباحتوں کو آدمیت کی تذلیل اور عظمت انسان کے منافی قرار دیا۔ اس ماحول سے ان کا سامنا ہو چکا تھا اس لیے انقلاب اور ترقی پسندی کے تصورات خود ان کے تخیل اور داخل سے ابھرے ہیں۔ انقلابی فکر کی پاداش میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ بورسٹل جیل لاہور میں انہوں نے جرمن مادیت اور مارکسیت کا مطالعہ کیا جس سے ان کی سوچ مزید مستحکم ہوئی۔ "عظمتِ آدم" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"جرمن مادیت سے مجھے کائنات کے بنیادی اصولوں کا شعور ہی نہیں ملا بلکہ اس سے مجھے مادی طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا پتہ بھی چلا۔ مجھے پتہ چلا کہ مارکسیت محض فن ہی نہیں بہت بڑی سائنس ہے، نظریہ نہیں عمل ہے۔"(۸)

ظہیر کاشمیری اور ان کے ہم خیال شعرا کے نزدیک زمین پر اس لعنت یعنی غلامی زمین کا سزاوار رہا ہے ان کے خیال میں جب تک وہ آزاد نہیں ہو جاتا ان کی صلاحیتوں کو زنگ لگتا رہے گا اور انسان کا جوہر کبھی سامنے نہیں آئے گا۔ ظہیر کاشمیری کے نزدیک طبقاتی تقسیم نہایت غیر فطری ہے۔ زمین پر بسنے والے تمام انسان مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ وہ اس تقسیم حقوق آدمیت سے بیزار ہیں اور ایک جہان نو کے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ اس نئے انسان کے ظہور کی خواہش کرتے ہیں۔ جو زمین پر انسانوں کی غیر فطری تقسیم ختم کر کے مساوی حقوق کا علمبردار ہو۔ ظہیر کاشمیری نے اپنی نظم "جہان نو ہو رہا ہے پیدا" میں آدم نو کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا ہے:

ہے آدمِ نو کی آمد آمد ، ہجوم رجعت بکھر رہا ہے
پرانی قدروں کا ہر محافظ خود اپنے سائے سے ڈر رہا ہے
زمیں پہ لرزہ ہوا ہے طاری، سروں سے پانی گزر رہا ہے
یہ انقلابِ امم کا لمحہ ، رقم نیا باب کر رہا ہے
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا ، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے (۹)

وہ انسان کی فکر میں پیدا ہونے والی رفعت اور بالیدگی کی بشارت دیتے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں کہ انسان کو اپنا مقصد زیست معلوم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب اولادِ آدم ایک دوسرے کا گلا کاٹنے سے باز آ جائے گی۔

آدمی خاک نشیں تا بہ سما پہنچا ہے
آج سب مقصد تخلیق بشر جان گئے
مقصدِ زیست نہیں معرکہ مال و منال
مقصدِ زیست ہے تسکیر جہاں مہ و سال
جنگ اب قصہ پارینہ ہے
آدم اب قسمت آدم کا نہ دشمن ہو گا
رنگ اور نسل کے باعث نہ کھلیں گے مقتل
آتش افروز نہ اقوام کا خرمن ہو گا (۱۰)

ظہیر کے ہاں رجائیت کا عنصر جو مذکورہ بالا چند اشعار میں نظر آتا ہے ان کی نظموں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ وہ اجالے کی نوید سناتے ہیں اور گھپ اندھیری رات کے بعد روشن سحر کی توقع رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں "نیا منشور، پامرد، الیشا، نئے موسموں کی بشارت اور منشورِ نو" میں رجائی لہجے سے ان کی خطیبانہ شعلہ بیانی کی گرج پیدا ہو گئی ہے۔ انہیں اپنے اشتراکی نظریے کی کامیابی کا کامل یقین ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"ظہیر کاشمیری کی نظمیں اشتراکی نظریے کے فروغ کا وسیلہ ہیں اور طبقاتی جدوجہد کو تقویت عطا کرتی ہیں اور اس کی طرف واضح اشارے مستقیم انداز میں صاف نظر آتے ہیں۔"(۱۱)

قیامِ پاکستان کے وقت جن نظم نگاروں کا طوطی بول رہا تھا ان میں ندیم قاسمی بھی تھے۔ اس دور میں وہ ترقی پسند تحریک کے سرگرم حامی تھے۔ ان کی شاعری کا ہیرو انسان ہے جو زندگی کے کھیل میں شدید کرب سے دوچار ہے۔ قاسمی کی شاعری ان اسباب وعلل سے برسرِ پیکار ہے جو آلامِ انسانی کا باعث ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے تصورِ آدمیت کا جائزہ لیں تو انسان ایک ایسی ہستی ہے جسے قدرت نے رفعتوں سے نوازا ہے اور یہ اپنے اور امکانات کی ہزاروں کائناتیں آباد کیے ہوئے ہے، اس کے باوجود سے ہی کائنات نے نموپائی اور اس ہنگامہ زار کو رنگ و بو نصیب ہوئے۔

ہم نے دھوئی چہرۂ آفاق سے گردِ ملال

پربتوں پر ہم نے ڈالے گھومتی راہوں کے جال
ہم نے صحراؤں کو بخشا سبزہ زاروں کا جمال
ہم نے ناپیدا کرانی کے کنارے پا لیے
خاک کے زروں کو یوں چھانا ستارے پا لیے
زندگی میں جوش ہے جذبات میں آہنگ ہے
چہرۂ گیتی ہمارے پیار سے گلرنگ ہے (۱۲)

قیامِ پاکستان کے بعد اہلِ وطن میں اہلِ منصب کی جاہ طلبی، موقع پرستوں کی وطن دشمنی اور اربابِ وطن کی بے حسی نے دانشور طبقہ کی تذبذب، عدمِ اطمینان اور تشکیک سے دوچار کیا۔ جہاں فیض احمد فیض نے اسے داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر سے تعبیر کیا تو ندیم نے اسے موہوم اجالا کہہ کر پکارا۔ اس دور میں وہ انسان کو ایک نئے عزم اور سمت کے تعین کی راہ دکھاتے ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں عوام کے دلوں میں جذبے کی چنگاری سلگاتے ہیں اور انقلابی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انسان کو احساس دلاتے ہیں کہ عظمت انسان کیا ہے؟ خدا نے تجھے پیدا کیا کیونکہ اس کی آرزو تھی کہ کوئی اس کو پہچانے اور مانے کہ وہ خالقِ انسان ہے۔ خدا کا وجود دنیا میں نہ ہونے کے مترادف تھا کیوں کہ یہاں کوئی اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ سوا اس عرش نشیں خدا کو زمین پر لانے والا انسان ہے۔ قاسمی حالات کی تبدیلی میں انسانی کردار کو جبر و مشیت پر غالب قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''انسان عظیم ہے'' ان کے تصور آدمیت کی غماز ہے:

اس نے تجھے عرش سے بلایا
انسان عظیم ہے خدایا تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا
تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر
پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں
وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا
انسان عظیم ہے خدایا تو نور ہی نور بن رہا تھا
وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا
آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم
لیکن تجھے دل سے مانتا تھا
اب چھونے لگا ہے تیرا سایا
انسان عظیم ہے خدایا

وہ انسان کی عظمیت کا اظہار، مذہب سے بیزاری یا ترقی پسند گروہ کے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت نہیں بلکہ اس میں مضمر عظیم عظیم صفات کے احساس سے کرتے ہیں، وہ انسان کے ادھورا، نامکمل اور تشنہ کام رہنے کے رائج

شدہ تصور سے جو نظموں میں بالعموم پایا جاتا تھا بالکل مختلف انداز میں سوچتے ہیں اور انسان کی صلاحیتوں اور احترامِ آدمیت کا اظہار کرتے ہیں۔

''شعلۂ گل'' کی نظموں جدلیاتی مادیت کا رویہ نمایاں ہے۔وہ انسانی دوستی کے جذبے سے مغلوب نظر آتے ہیں۔وہ موقع و محل کے مطابق اپنے داخل میں جاگزیں اسلام کی روشنی کا عکس بھی دکھاتے ہیں۔نظم ''حجاز'' میں وہ محبوبِ خدا (انسان) کی تیرہ بختی پر محبّ (خدا) سے شکوہ کرتے ہیں۔

چھلکا پڑتا ہے ستاروں سے تیرا ساغرِ شب
میری قسمت میں فقط ایک چراغ مردہ
کیا تجھے عرش کی خلوت کا سکون چبھتا ہے
فرش پر ہو ترا محبوب اگر آزردہ (۱۴)

ندیم کے رجحانات و میلانات ''دشتِ وفا'' تک پختگی اختیار کر لیتے ہیں۔اس مجموعہ میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک کا کلام شامل ہے۔نظم کے ارتقائی مراحل میں اس مجموعہ میں ان کے نظریات مزید نکھر کر سامنے آتے ہیں۔امجد اسلام امجد دشتِ وفا کی نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آزادی و حریت کے جذبات اور عظمتِ انسان کا تصور بھی اس کتاب کے اہم مسائل ہیں لیکن اظہار میں شاعر پہلے سے زیادہ منجھا ہوا نظر آتا ہے۔'' (۱۵)

انسان زمین پر مسلسل کرب اور الم سے دوچار ہے۔وقت نے اس کی شکست و ریخت میں کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھی مگر انسان بے زبان ہو کر آلامِ زمانہ سے سہے جا رہا ہے۔

زمین پر انسان سے انسان کی دوری صرف ایک صورت میں ختم ہو سکتی ہے اگر آدمیت کے بنیادی تقاضے کے مطابق انسان، انسان سے محبت کرے۔ندیم انسانی زندگی کو عشق کرنے کے لیے بہترین وقت خیال کرتے ہیں۔لیکن افسوس انسان اس کو ضائع کرتا ہے۔ندی کے تصور میں انسان نے اپنے دل میں دوسروں کے لیے بغض اور نفرت کے جذبات سمو لیے ہیں۔ندیم اپنی نظم میں یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کو انسان سے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ اب وہ قیامت کاٹے گا۔وہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش:

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سو ایک تبسم کا ہو عالم طاری
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو روئے زمیں پر، نہ فضا میں بمبار

لاکھ طوفان اٹھیں ، لاکھ عناصر کرجیں

عشق چاہے تو شجر کیا ، کوئی پتہ نہ ہلے
آدمیت کا جو منصب ہے ، اسے پہچانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے اے انسانو! (۱۶)

ندیم تصورِ آدمیت پر مغرب کی ہیومنزم کی تحاریک اور مشرق کے صوفیانہ تصورات کے آثار نمایاں ہیں لیکن ان کا رویہ سراسر تقلیدی نہیں بلکہ انہوں نے ان دونوں تصوراتِ انسان کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ ندیم نے خدا کے پردہ تجرید میں ہونے کے صوفیانہ تصور کو رد کر دیا اور انسان کے مابین فاصلوں کو ختم کیا۔ انہوں نے مغرب کے انسان دوستی کے اس تصور کی نفی کی جو مذہب اور خدا کو غیر ضروری قرار دے کر کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ احتشام حسین، **اردو میں ترقی پسند کی روایت**، کراچی: ارتقاء، شمارہ ۲۰، ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳۲۴
۲۔ سلیم طارق، **تلخ یادیں**، کراچی: روزنامہ امروز، ۴ مارچ ۱۹۴۸ء
۳۔ فیض احمد فیض، **نسخہ ہائے وفا**، لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۳
۴۔ ایضاً، ص ۸۰
۵۔ ایضاً، ص ۸۱
۶۔ گوپی چند نارنگ، ''فیض احمد فیض کا جمالیاتی احساس اور معیاتی نظام''، مشمولہ **فیض احمد فیض عکس اور جہتیں**، مرتبہ: شاہد ماہلی، نئی دہلی: معیار پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۰
۷۔ ظہیر کاشمیری، **عشق و انقلاب**، لاہور: الحمد پبلشرز، ۱۹۵۵ء، ص ۲۰
۸۔ ایضاً ، ص ۱۶
۹۔ ایضاً ، ص ۶۷
۱۰۔ ایضاً ، ص ۳۰۵
۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو نظم کی دو آوازیں''، مشمولہ **اوراق**، جدید نظم نمبر، لاہور: جولائی اگست ۱۹۷۷ء
۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، **شعلہ گل**، لاہور: مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۵ء، ص ۷۷
۱۳۔ ایضاً ، ص ۷۰۔۶۹
۱۴۔ ایضاً ، ص ۳۸
۱۵۔ امجد اسلام امجد، ''احمد ندیم قاسمی کی نظمیں''، مشمولہ **افکار** ندیم نمبر، کراچی: مکتبہ افکار، فروری ۱۹۷۵ء
۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، **محیط**، لاہور: التحریر، ۱۹۷۸ء، ص ۱۲۳